

رأس المال

(مفہوم و مصداق)

محمد سعد صدیقی

کوئی محقق اس موضوع سے متعلق مختلف رائے رکھتے ہوں، تو اپنا مقالہ بھجوا کر تارئین فکر و نظر کو مستفید فرمائیں۔ (مدیر)

مال کے لغوی معنی:

مال کا مادہ "میل" ہے میل کے معنی میلان کے ہیں یعنی کسی ایک جانب متوجہ ہونا، راغب کے بقول مال کو مال اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی کسی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور زائل ہونے والا ہے۔ اور اس بنا پر اس کو "عرض" (سامان) کہا جاتا ہے کہ یہ کسی چیز کے عارضی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے راغب ایک قول نقل کرتے ہیں۔

العال، فحبة تکون یوما فی بیت عطار و یوما فی بیت یبطار^(۱)

(مال، ہاتھ کا میل ہے ایک دن عطار (متمول) کے پاس اور دوسرے دن کسی تھی دامن کے پاس ہوتا ہے)

قرآن حکیم میں مال کا لفظ عمومی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد زر نقد بھی ہو سکتا ہے، سامان بھی ہو سکتا ہے اور غیر منقولہ جائیداد بھی۔ جن مقامات پر باطل طریقہ سے مال کمانے کی نفی کی گئی ہے وہ اسی عموم میں شامل ہیں جہاں مال تجارت میں خسارہ کی بات کی گئی ہے، وہاں مال سے مراد سامان تجارت ہے۔ (۲) اور جہاں مال گننے کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں مال کا مفہوم زر نقد سمجھ میں آتا ہے۔ (۳) ابن عربی احکام القرآن میں مال سے مراد درج ذیل اشیاء لیتے ہیں۔

۱۔ سامان مملوکہ، اس کے اندر منقولہ و غیر منقولہ ہر قسم کا ایسا مال آگیا جو کسی شخص کی

ملکیت میں ہو۔

۲۔ تجارت سے حاصل شدہ منافع، اس کی تین اقسام ہیں۔

الف۔ نقد منافع ب۔ ادھار منافع ج۔ متوقع منافع ذرخت کا پھل یا کھیت کی پیداوار، صنعت و حرفت یا کرایہ۔

ان تمام اشیاء کو قرآن حکیم میں مال شمار کیا گیا ہے۔ اور کسی بھی ایسی زیادتی کو سود شمار کیا گیا ہے کہ جو عوض سے خالی ہو۔ (۴) سود کیا ہے اور رأس المال کے معنی کیا ہیں اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ اس زمانہ میں مروج سود کے طریقوں پر بحث کی جائے۔

زمانہ جاہلیت کا رہا:

اسلام سے قبل اور نبی کریمؐ کی بعثت کے بعد لیکن سود کے حرام ہونے سے قبل سود کی جو عمومی شکل مروج تھی وہ یہ تھی کہ ایک شخص اپنی ضرورت کے لئے کسی سے رقم قرض لیتا تھا، ایک خاص مدت کے بعد اسے لوٹانے کا معاہدہ طے پاتا تھا اس مدت کا ایک معاوضہ طے کر لیا جاتا تھا، اگر مدیون نے مدت متعینہ میں قرض لوٹا دیا تو معاوضہ میں اضافہ نہ کیا جاتا اور اگر مدیون مہلت طلب کرتا تو مہلت بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کا معاوضہ بھی بڑھا دیا جاتا۔ اور اس معاملہ کو معاملہ بیع سمجھا جاتا تھا، کہ مدیون کو مہلت دی جا رہی ہے اور اس کا معاوضہ حاصل کیا جا رہا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حرمت سود کے وقت بھی ایک شکل سود کی مروج تھی اور اسی کو قرآن حکیم نے حرام قرار دیا ہے۔ تجارتی و اجتماعی سود اس وقت مروج تھا نہ اس کی حرمت قرآن حکیم میں نازل ہوئی۔ اولاً تو یہ تصور ہی غلط ہے کہ سود کی صرف یہی شکل مروج تھی بلکہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا تجارتی اور اجتماعی سود بھی مروج تھا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سود کی کوئی اور شکل مروج نہ تھی تو حسب ذیل اصول و کلیات کی رو سے ہر قسم کا سود حرام ہو گا۔

۱۔ کسی بھی آیت کا شان نزول اس کے نازل ہونے کا سبب ہوتا ہے، اس آیت سے مستنبط حکم کی علت نہیں ہوتا۔ اگر شارع (قرآن حکیم) یا اولین مفسر شارع (نبی کریمؐ) نے کسی حکم کو کسی خاص علت یا حالات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور آیات کے الفاظ عام ہیں،

تو حکم بھی عام ہو گا اور بلا کسی واضح قرینہ کے اس کی تخصیص جائز نہ ہوگی۔ (۵) چنانچہ یہاں بھی سود کی حرمت کے نزول کے وقت مروج سود کی ایک خاص شکل حرمت سود کے نزول کا سبب ہے، اس کی حرمت کی علت نہیں۔ لہذا صرف اس خاص شکل کو حرام باقی اشکال کو حلال سمجھنا قرآن حکیم کے مجموعی تصور، اس کے احکام اور اس کی ہمہ گیری اور عالمگیری نوعیت کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ از روئے قرآن شراب، مردار اور جوأ حرام ہے تو کیا شراب کی صرف وہی قسم حرام ہے جو اس زمانہ میں مروج تھی اور آج اگر کوئی جدید نشہ آور چیز معرض وجود میں آتی ہے تو وہ اس وجہ سے حلال ہوگی کہ نبی کریمؐ کے زمانہ میں یا حرمت شراب کے حکم کے نزول کے وقت موجود نہ تھی۔ یا قمار (جوئے) کی کوئی جدید شکل اس وجہ سے حلال ہوگی کہ یہ شکل زمانہ نبویؐ میں مروج نہ تھی۔ یہ عقیدہ و نظریہ احکام قرآنی اور شریعت کے ہمہ گیر بنیادی تصور اور حلال و حرام کے سلسلہ میں متعینہ اصول کے بھی سراسر خلاف ہے۔

۲- آیت سود میں حرمت کے بعد رأس المال لینے کی اجازت دی اور یہ ارشاد فرمایا:

لا تظلمون ولا تظلمون۔ (۶) نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے یعنی معاملہ سود کا نتیجہ بہر حال ظلم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی ظلم و زیادتی کی بناء پر اس کو حرام قرار دیا گیا۔ ظلم کی ایک شکل تو یہ ہے کہ مدیون سے قرض کی ادائیگی کی مہلت پر اس سے معاوضہ طلب کیا جائے، یہ مدیون پر ظلم ہے۔ ظلم کی دوسری شکل یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو یا کسی ادارہ کو کچھ رقم کاروبار کے لئے دیتا ہے، اصل زر (رأس المال) کے ساتھ ایک نسبت منافع کی طے کر لی جاتی ہے اور وہ منافع بہر طور اسے ملنا ہے۔ اس معاملہ میں دو امکانی صورتیں ہیں۔

الف۔ ادارہ کو منافع اس طے شدہ شرح سود سے زیادہ ہوا لیکن مالک سرمایہ صرف اس قدر منافع لینے کا پابند ہے جس قدر کہ ابتداء معاملہ میں طے ہو گیا تھا، یہ مالک سرمایہ پر ظلم ہے۔

ب۔ منافع اس قدر نہیں ہوا بلکہ اس شخص کو یا اس ادارہ کو نقصان ہوا ہے لیکن یہ شخص یا ادارہ طے شدہ منافع دینے کا پابند ہے، یہ اس تاجر، شخص یا ادارہ پر ظلم ہے۔ شریعت

کسی ایسے معاملہ کو منعقد کرنے کی کسی صورت میں اجازت نہیں دے سکتی جس میں فریقین میں کسی ایک پر ظلم و زیادتی کا امکان ہو۔ بھر جبکہ خاص سود کے معاملہ میں اس ظلم و زیادتی کو صراحت کے ساتھ روک دیا گیا۔

مزید برآں یہ فرض کر لینا کہ سود کی صرف ایک شکل مروج تھی، غلط ہے۔ بعض روایات سے سود کی تجارتی قسم اور اجتماعی سود کے رائج ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ علامہ عینی کی نقل کردہ ایک روایت کے مطابق بنی عمرو بن عمیر اور بنی مغیرہ میں سودی لین دین ہوا کرتا تھا۔ بنی مغیرہ مسلمان ہو گئے اور سنہ ۹ھ میں بنی عمرو بھی مسلمان ہو گئے۔ (۷) تو سود کی جو رقم بنو مغیرہ کے ذمہ واجب تھی، بنی عمرو نے بالاتفاق اعلان کیا کہ ہم نے توبہ کی اور اب صرف رأس المال لیں گے، سود نہ لیں گے۔ (۸) اسی طرح حضرت عباس کی سود کی ایک بڑی رقم بنو تمیمت کے ذمہ تھی، حضرت عباس نے مطالبہ کرنا چاہا لیکن نبی کریمؐ کے منع کرنے پر آپ نے اپنی سود کی بڑی رقم چھوڑ دی۔ (۹) اور حضرت عثمانؓ کی ایک رقم ایک سوداگر کے ذمہ تھی، ان دونوں حضرات نے بھی نبی کریمؐ کے حکم سے یہ رقم چھوڑ دی۔ (۱۰)

ان واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تجارتی سود بھی مروج تھا اور بنو عمرو کے واقعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اجتماعی سود کی شکل بھی رائج تھی اور سود کی ان تمام شکلوں کو بیک جنبش قلم ختم کر دیا گیا۔ اس اصول کے تحت سرمایہ دار کمپنیاں (Investment companies) کے ساتھ سرمایہ کاری کر کے اس پر سود لینا بھی حرام ہے۔ بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر اور بچت سکیموں کے سرٹیفکیٹ پر متعینہ منافع بھی سود کی تعریف میں داخل ہے اور اسی طرح حرام ہے جس طرح قرضہ پر سود حرام ہے۔

پروفیسر محمد طاہر القادری نے اپنی کتاب بلاسود بنکاری میں ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ اور اس قسم کی دیگر چھٹی سکیموں کے سرٹیفکیٹ کے متعلق یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حکومت اپنے مختلف سرٹیفکیٹ خریداروں کو فروخت کرے اور اسی وقت یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ کانڈ آپ اگر ایک سال کے بعد ہمیں فروخت کریں گے، تو اس کی مالیت اس قدر ادا کی جائے گی اور دو سال بعد فروخت کریں گے تو اس قدر اضافی قیمت ادا کی جائے گی، اس شکل میں دونوں مرتبہ یہ معاملہ بیع منعقد ہو گا اور اس پر منافع حاصل کرنا اسی طرح جائز ہو گا جس طرح دیگر مسلمان پر (۱۱)

پروفیسر صاحب کا یہ موقف احکام قرآنی اور تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں غلط ہے اور اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں۔

۱۔ پروفیسر صاحب کا درج بالا نظریہ اس بنیاد پر مبنی ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ ایک مال یا سامان کی حیثیت رکھتے ہیں اور خریداری کے بعد خریدار کی ملکیت میں آجاتے ہیں۔ پھر ان پر وہ منافع حاصل کر کے دوبارہ فروخت کر سکتا ہے، حالانکہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ مال نہیں ہے بلکہ اس رقم کی ایک رسید ہے جو سرمایہ کار نے محکمہ میں جمع کرائی ہے اور یہ بات عیاں ہے کہ رسید کوئی مال متقوم نہیں جس کی بیع و شرا (خرید و فروخت) کی جاسکے۔

۲۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ سے حاصل شدہ رقم محکمہ، دفاعی سامان بنانے پر صرف کرتا ہے اور اس دفاعی سامان (اسلحہ وغیرہ) کو ملک میں مختلف ایجنسیوں کو فروخت اور بیرون ملک برآمد کیا جاتا ہے، اس سے حاصل شدہ منافع کی ایک خاص حد ان لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے جنہوں نے یہ سرٹیفکیٹ خریدے ہوئے ہوں، محکمہ یہ اعلان نہیں کرتا کہ اسے کس قدر منافع ہوا ہے اور اس میں سے کس قدر ان لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

۳۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے والوں کو محکمہ میں سرمایہ کار کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اسے قواعد و ضوابط میں "Investor" کے لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ محکمہ کے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہوتا ہے جو محکمہ اس رقم سے کرتا ہے اور یہ شرکت و مضاربت کی صورت ہے جس میں معینہ منافع سود میں داخل ہوتا ہے۔

۴۔ یہ بات بلاشبہ درست ہے کہ مال کی ملکیت کانڈ کے ذریعہ ہی سے ثابت ہوتی ہے کسی جائیداد کے کسی شخص کی ملکیت میں ہونے کا ثبوت متعینہ کانڈ ہی ہوتے ہیں لیکن مملوک مال کا ایک علیحدہ وجود ہوتا ہے جس کو خرید و فروخت کے وقت باقاعدہ قبضہ میں لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اموال غیر منقولہ میں ایک کانڈ جسے سند قبضہ جاری کی جاتی ہے کہ مشتری نے موقع پر خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح منقولہ املاک کی

Delivery SIIP دی جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اصل مال مستقوم وہ جائیداد یا چیز ہے جس پر قبضہ کیا گیا ہے یا جسے مشتری کے سپرد کیا گیا ہے۔ کانڈزات اس کی قانونی اور ضابطہ کی خریداری کی ایک سند ہوتے ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ صرف کانڈزات فروخت کرے اور جس مال سے متعلق وہ کانڈزات ہیں، اسے فروخت نہ کرے، ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ اسی طرح کے کانڈزات ہیں جو اس رقم کی تصدیق و ضمانت ہیں کہ ان کی اس قدر رقم جو اس سرٹیفکیٹ کی (Face value) ہے، محکمہ کے قبضہ میں ہے۔

۵۔ کسی بھی چیز کے معاملہ بیع منعقد ہونے کے بعد جب خریدی ہوئی چیز پر خریدار قبضہ کر لیتا ہے اور معاملہ بیع مکمل ہونے کے بعد مجلس برخواست ہو جاتی ہے، تو فروخت شدہ چیز فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ خریدار اب اس کا قانونی، اخلاقی اور شرعی مالک ہوتا ہے اور اس میں تصرف کا حق اسے حاصل ہوتا ہے۔ اب وہ چیز خریدار کسی کے ہاتھ فروخت کرے، کسی کو ہدیہ کر دے یا ضائع کر دے ان تمام تصرفات کے حقوق اس کو حاصل ہیں۔ فروخت کنندہ اس سلسلہ میں کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کر سکتا جبکہ اس سرٹیفکیٹ کے سلسلہ میں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ مال ہے اور اس کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے تو اس میں حسب ذیل پابندیاں خریدار پر عائد ہیں:

- الف۔ ایک خاص مدت سے قبل یہ خریدار ان کانڈزات کو فروخت نہیں کر سکتا۔
- ب۔ وہ کانڈزات صرف ڈاک کے محکمہ کو جہاں سے وہ جاری ہوئے ہیں، فروخت کر سکتا ہے۔ قواعد و ضوابط کی رو سے وہ کانڈزات کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کیے جاسکتے۔
- ج۔ ایک خاص متعین منافع یا قیمت پر دوبارہ خریداری عمل میں آسکتی ہے۔ مالک نہ قیمت میں کوئی کمی کر سکتا ہے اور نہ زیادتی۔

یہ تمام پابندیاں معاملہ بیع کو فاسد کرنے والی ہیں۔ خریدار کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مملوک چیز کو کسی کے ہاتھ، کسی بھی منافع پر فروخت کر دے۔

ان حقائق کی روشنی میں بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ اس معاملہ کو بیع پر قیاس نہیں کیا جا

سکتا اور نہ ہی مال پر منافع کے احکام اس پر جاری کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بہر حال سود ہے البتہ اس کے جواز کی یہ شکل ہو سکتی ہے کہ اس کا تعین رأس المال کی شرح پر کرنے کی بجائے منافع کی شرح پر کر دیا جائے کہ مثلاً دس ہزار روپیہ کے سرٹیفکیٹ خریدنے والوں کو منافع کا اتنے فیصد حصہ ملے گا اور ہر سال کل منافع کا اعلان کیا جائے۔ چونکہ یہ رقم جائز کاروبار میں لگ رہی ہے اس لئے اس صورت میں جائز ہو گا۔

سود کی اس وضاحت اور اس کے ان احکام کے بعد رأس المال پر بحث کی جائے گی۔ اور اس المال کے مصداقات متعین کیے جائیں گے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کس مال میں رأس المال پر زیادتی سود کھلائے گی۔ اس بحث کا انحصار دو امور پر ہو گا۔

- الف۔ مال کے معنی اور اس کا مصداق کیا ہے؟
 ب۔ نقد کی تعریف، اس کے مصداقات کیا ہیں؟
 مال کے معنی:

المال ما یمیل الیہ الطبع ویمکن ادخاره لوقت الحاجة و المالیة تثبت بتمول الناس
 كافة او بعضهم۔ (۱۳)

(مال وہ چیز ہے جس کی طرف انسانی طبیعت مائل ہو، اور اس کا مشکل وقت کے لیے جمع کیا جانا بھی ممکن ہو، مزید یہ کہ کسی بھی چیز کی جانب تمام انسانوں یا بعض لوگوں کے میلان طبع سے کسی چیز میں مالیت ثابت ہو جاتی ہے)۔

گویا جس چیز کے اندر حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہوں، وہ مال کی تعریف میں داخل ہو گا۔

- الف) جس کی طرف زیادہ تر یا تمام تر لوگوں کا میلان ہو۔
 ب) جس چیز کو کسی حاجت یا ضرورت کے لئے جمع رکھا جاسکتا ہو۔ ان دو خصوصیات سے نتیجہً ایک تیسری خصوصیت سامنے آتی ہے۔
 ج) جس چیز پر کسی کے مالکانہ حقوق قائم ہو سکتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس چیز کو خاطر جمع رکھا جاسکے وہ مال ہے اور امام شافعی

کے نزدیک جس چیز میں کسی کی ملکیت بننے کی صلاحیت ہو، وہ مال ہے۔ فقہ السنۃ میں بیان کردہ تعریف سے ایک مزید خصوصیت سامنے آتی ہے۔

«المال کل ما یملک وینتفع بہ وسمی مالا لمیل الطبع الیہ» (۱۳)

(مال ہر وہ چیز ہے جس کی ملکیت ممکن ہو، جس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہو، اور مال کو مال اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی طرف لوگوں کی طبیعتوں کا میلان ہوتا ہے)

یعنی صلاحیت، ملکیت و میلان طبع کے علاوہ منفعت اس کے اندر موجود ہو۔ ان تعریفات کی روشنی میں یہ بات کہنی ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک خصوصیت کے پائے جانے سے کوئی چیز مال بن جائے گی کیونکہ بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کی طرف میلان طبع ہوتا ہے، ان میں ملکیت بھی ہو سکتی ہے لیکن انہیں ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا مثلاً پھل، سبزیاں، برف، دودھ وغیرہ۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں مال ہیں۔ مصطفیٰ زرقانے مال کی حسب ذیل تعریف کی ہے جو اپنے مفہوم و مصداق کے اعتبار سے جامع ہے۔

«المال ہو کل عین ذات قمیة مادیة بین الناس» (۱۴)

(مال وہ چیز ہے جس کا ایک مادی وجود ہو اور لوگوں کے درمیان اس کی کوئی حیثیت و قیمت ہو)۔

یعنی ایک ایسی چیز جس کا مادی و ذاتی وجود ہو، جس کی قیمت معاشرہ میں ادا کی جاتی ہو اور افراد معاشرہ اس کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہوں اور اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ ایک خاص مدت تک کم یا زیادہ، اس کو حسب ضرورت رکھا جاسکتا ہو۔۔۔ امام سرخی کی عبارت سے مال کی حسب ذیل تعریف سمجھ میں آتی ہے۔

«مال وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا اور احکام شریعت میں اس کی تجارت اور اس سے حصول منافع کو جائز کیا»۔ (۱۵)

یعنی امام سرخی کے نزدیک ہر وہ چیز مال ہے کہ جو انسان کی کوئی بھی ضرورت پوری کر سکتی ہو، جس کی تجارت کی جاسکتی ہو اور جس سے منافع حاصل کیا جاسکتا ہو۔ جزیری نے مال کی تعریف کرتے ہوئے اس کی شرعی حیثیت پر بحث کی ہے اور اس کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔

(الف) ایسی چیز جس سے بوقت ضرورت کوئی فائدہ حاصل کر سکے۔
 (ب) ایسی چیز جس سے فائدہ حاصل کرنا یا جس کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہو۔ (۱۶) یہ تعریف بھی امام سرخسی کی تعریف کے مشابہ ہے جس میں ان تمام اشیاء کو مال کی تعریف سے نکال دیا گیا جن کی تجارت شریعت نے حرام قرار دی ہے۔ مثلاً شراب اور سور کا گوشت۔ یہ دونوں اشیاء ایسی ہیں کہ لوگوں کا اس طرف میلان بھی ہے اور انہیں ذخیرہ بھی کیا جاسکتا ہے اور ان سے منافع بھی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ شریعت نے ان چیزوں کی تجارت کو حرام قرار دیا۔ لہذا یہ چیزیں مال کی تعریف میں داخل نہ ہوں گی۔

مال کی ان تعریفات سے مال کی تین اقسام سامنے آتی ہیں:

- ۱- نقود
- ۲- اموال منقولہ
- ۳- اموال غیر منقولہ

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

الف۔ نقود کے مصداقات کیا ہیں؟

ب۔ ان اموال میں سے کس مال میں صرف رأس المال لینے کی اجازت ہے؟

نقد کی تعریف:

علامہ جزری نقد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”الذهب و الفضة المسكوتين باتفاق اهل المذهب و تصح بالفلوس الرائج على المفتى به، والمراد بالفلوس الرائج ما يتعامل به من غير الذهب و الفضة كالقروش الصاغ و التعريفه وغيرهما من النقد المتخذ من النيكال او النحاس ما دام التعامل به قائما فلا تجوز المضاد به بالذهب و الفضة اذا لم تكن مضروبة“ (۱۷)

(سونا اور چاندی جب کہ ان پر حکومت کی مرہو نقد میں باقیات علماء شامل ہیں اور راجع قول کے مطابق ان ہیسیوں پر بھی نقد کا اطلاق ہوتا ہے جو معاشرے میں مروج ہوں۔

معاشرے میں مروج پیسوں سے مراد سونے چاندی کے علاوہ دیگر کسی بھی دھات یا کسی بھی چیز کے سکے جن کو معاشرے میں بطور نقد قبول کر لیا گیا ہو وہ نقد شمار ہوں گے جب تک کہ معاشرے میں ان کی یہ حیثیت برقرار ہے اور سونا اور چاندی کی ڈلیاں جبکہ وہ سکوں کی شکل میں نہ ڈھلی ہوں اور حکومت کی ان پر مہر نہ ہو نقد شمار نہ ہوں گی۔

امام جزری کے اس بیان کے مطابق سونا اور چاندی بانفاق فقہاء نقد کی تعریف میں داخل ہیں۔ البتہ سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں سے بنے ہوئے مروج سکوں کو نقد میں شامل کرنے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں لیکن راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ یہ بھی نقد میں شامل ہیں۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں رائج کرنسی نوٹ نقد میں داخل ہیں یا نہیں۔ ہمارے ملک کے بعض ارباب فتویٰ اس کو نقد شمار نہیں کرتے بلکہ یہ نقد کی ایک ضمانت یا اس کا عنوان ہیں۔ اور اس پر لکھی ہوئی مالیت بنک دولت پاکستان کی طرف سے متعین ہے جس پر حکومت پاکستان ضامن ہے۔ جبکہ زیادہ تر فقہاء و مفتیان کی رائے کے مطابق کرنسی نوٹ نقد میں داخل ہیں اور یہی رائے صائب معلوم ہوتی ہے جس کی حسب ذیل وجوہ ہیں۔

۱- علامہ جزری کی ایک عبارت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

ومنها ان یکون رأس المال ذہبا او فضة مختومین بختم الملک فلا تصح اذا کان رأس المال قطع ذہب او فضة لم تضرب۔ (۱۸)

(مضاربت کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ رأس المال سونے چاندی کے ان سکوں کی شکل میں ہو جو حکومت نے مہر لگا کر بطور سکہ جاری کیے ہیں۔ چنانچہ سونے چاندی کی ان ڈلیوں سے مضاربت جائز نہ ہوگی جن پر حکومت کی مہر نہ ہو)

اس عبارت سے یہ چیز سمجھ میں آ رہی ہے کہ سونے چاندی کو بھی نقدی یا سکہ کی حیثیت جب حاصل ہوگی جبکہ اس پر حکومت کی مہر تصدیق ثبت ہوگی اور وہ بطور سکہ لوگوں میں رائج ہو۔

۲- عرف عام میں کرنسی نوٹوں کو نقد (Cash) کی حیثیت حاصل ہے۔ تمام تجارتی بنک اور ادارے جو رسید نقد کی وصولی کی جاری کرتے ہیں، وہ دوسری اشیاء مثلاً چیک یا ڈرافٹ

وغیرہ کی رسید سے مختلف ہوتی ہے۔ عرف عام احکام شریعت میں ایک مصدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاهلین^(۱۹)
(سرسری برتاؤ کو قبول کر لیا کیجئے اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجئے)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں۔

"لوگوں کے اعمال و اخلاق میں تمہ اور حقیقت تلاش نہ کیجئے بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہو، اس کو بھلائی پر محمول کیجئے۔ باطن کا حال اللہ کے سپرد کر دیجئے، حاصل یہ کہ معاشرہ میں سہولت رکھئے تشدد نہ کیجئے۔" (۲۰)

یعنی معاشرتی معاملات میں، جہاں تک قرآن کریم اور سنت نبی کریم اجازت دے وہاں تک سہولت کو اختیار کرنا چاہئے۔ کسی غیر ضروری تشدد میں خود مبتلا ہونا چاہئے نہ ہی امت کو مبتلا کرنا چاہئے۔

ملا جیون لکھتے ہیں۔

"اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو مچھلی کھانے سے اس پر کفارہ قسم واجب نہیں ہو گا کیونکہ گوشت خون سے بنتا ہے اور خون والا جانور پانی میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ مزید یہ کہ مچھلی بیچنے والا شخص عرف عام میں گوشت بیچنے والا نہیں کہلاتا اگرچہ قرآن حکیم میں لمّا طریماً کہا گیا ہے۔" (۲۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قسم میں کفارہ اس مصداق پر ہو گا جو عرف عام میں مراد ہوتا ہے ظاہری الفاظ پر نہیں ہو گا حتیٰ کہ ظاہری الفاظ کا مصداق عرف عام کے مصداق سے اگر مختلف ہو تو، عرف عام کے مصداق پر عمل ہو گا نہ کہ ظاہری الفاظ کے مصداق پر۔ عرف عام کی شرعی مصدریت و حیثیت پر علامہ شاطبی نے الموائقات میں، ابن نجیم نے الاشباه والنظائر میں، مہجی محمسانی نے فلسفہ التشریح فی الاسلام میں، ابن عابدین نے مجلہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔ خوف طوالت سے اس کو ترک کیا جا رہا ہے۔

۳- اشیاء میں اصل اباحت ہے معاشرتی معاملات میں کوئی بھی شے اس وقت تک ناجائز نہیں قرار دی جا سکتی جب تک کہ وہ صراحتاً شارع نے ناجائز نہ قرار دی ہو یا اس میں کوئی ایسی علت پائی جاتی ہو جس کی وجہ سے کسی شے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ کرنسی نوٹوں کے نقد شمار کرنے کی ممانعت صراحتاً شریعت میں موجود ہے نہ اس کے اختیار کرنے میں کسی حرام کام کا ارتکاب ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر کسی دوسری شے کو حرام قرار دیا گیا ہو۔

۴- کرنسی نوٹوں کو نقد قرار نہ دینے میں ایک بڑی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ اس طرح ہم سودی بنگاری اور سودی نظام سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ کیونکہ بنگاری میں سودی نظام کا متبادل مضاربت ہے اور مضاربت صرف نقدی ہی سے منعقد ہو سکتی ہے۔

۵- کرنسی نوٹ کو نقدی قرار نہ دینے والے کیا اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ایک شخص پچاس روپے کا نوٹ ساٹھ روپے میں یا بیس روپے (بلا ادھار) فروخت کر دے کیونکہ غیر نقد اموال میں اضافہ سود نہیں منافع ہوتا ہے جیسا کہ اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

۶- کرنسی نوٹ حکومت کی ضمانت سے جاری ہوتا ہے اور آئین کے آرٹیکل کی رو سے کرنسی نوٹ کی وصولی سے انکار جرم ہے اور اس پر قید کی سزا دی جا سکتی ہے جبکہ دیگر ادائیگیوں مثلاً چیک یا ڈرافٹ کا انکار جرم نہیں ہے۔

۷- کرنسی نوٹ کو نقد نہ سمجھنے کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ زکوٰۃ ادا نہیں کی جا سکتی اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ سکوں کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی جائے اور سکوں کا حصول ایک امر مشکل ہے۔ خصوصاً جس شخص یا ادارہ کی زکوٰۃ لاکھوں روپوں میں بنتی ہو۔ عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ سکے اس کے لئے مخصوص کیے جاتے ہیں، ان سکوں کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے اور پھر وہ سکے واپس لے کر نوٹ دے دیے جاتے ہیں تاکہ وہ سکے سال آئندہ استعمال ہو سکیں۔ یہ حیلہ کیا اہل کتاب کے اس عمل سے مشابہ نہیں کہ جب انہیں ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کیا گیا تو انہوں نے ہفتہ کے روز وہ چھلیاں ایک نالی میں منتقل کر لیں اور آئندہ روز انہیں شکار کر کے یہ خیال کیا کہ ہم نے

اللہ کے حکم کی اطاعت کی۔

۸۔ نبی کریمؐ کا صرف سونے اور چاندی کے سکوں کو نقد فرمانا اس بنا پر ہے کہ اس زمانہ میں نقد وہی مروج تھا، اگر آپ کے حکم کو اس طرح مخصوص و مقید کر دیا جائے تو یہ دین کے اس ہمہ گیری تصور کے خلاف ہے، جو نبی کریمؐ لے کر آئے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شراب اسی قسم کی حرام ہوگی جس نوع کی شراب حضورؐ کے زمانہ میں لوگ پیا کرتے تھے۔ آج اگر شراب کی کوئی نئی قسم ایجاد ہوتی ہے تو وہ حرام نہ ہوگی یا قمار کی صرف وہی شکل حرام ہوگی جو حضورؐ کے زمانہ میں مروج تھی، کوئی جدید شکل حرام نہ ہوگی۔ غرضیکہ اس طرح متعدد دینی خرابیاں اور قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ کرنسی نوٹ نقد کے حکم میں ہیں تو بلاشبہ یہ کہا جائے گا کہ یہ سونے اور چاندی کے حکم میں ہوں گے اور سونے اور چاندی کے ادھار میں یا پیدائیدار لین دین میں زیادتی رہا شمار ہوگی۔ لہذا نقد میں بھی خواہ وہ بک میں جمع ہوں یا اپنے قبضہ میں ہوں متعینہ زیادتی سود شمار ہوگی۔ البتہ مضاربت کی شکل جس کی تفصیل بیان کی جا چکی، کاروبار جائز ہونے کی صورت میں منافع جائز ہوگا۔

کرنسی کا اتار چڑھاؤ:

کرنسی کی قدر و قیمت کا اتار چڑھاؤ اس سلسلہ میں اہمیت رکھتا ہے، دنیا کے اقتصادی حالات میں اشیاء ضرورت کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور کرنسی کی قدر و قیمت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معاملہ قرض میں یا کسی بھی مالی لین دین میں کرنسی کی قدر کے اس رجحان کا خیال رکھنا چاہئے اور قرض کی واپسی کے وقت رقم میں اسی شرح سے اضافہ کر دیا جائے۔ تو وہ سود کی تعریف میں داخل نہ ہوگا۔ اسی اضافہ کو اصطلاحاً مارک اپ (Mark up) کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

۱۔ گزشتہ اوراق میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ معاشرہ میں مروج کرنسی نوٹ بھی نقد ہی کے حکم میں ہیں اور نقد میں اضافہ سود کہلاتا ہے۔ خواہ اس کا محرک کچھ بھی ہو۔

۲۔ احکام شریعت میں عرف عام کی اہمیت اور اصول شریعت میں اس کی بنیادی حیثیت پر بھی

اور اوراق گذشتہ میں مختصراً بحث کی گئی، اس اصول کی روشنی میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام لین دین میں رقم کی وہی قدر معتبر مانی جاتی ہے جو اس پر درج ہوتی ہے۔ معاملہ قرض میں بھی مقروض پر وہ رقم واجب ہوتی ہے جو اس نے وصول کی ہے۔ نہ کہ اس کے مساوی قدر کی رقم۔ اس بناء پر اس رقم میں جو بھی اضافہ ہو گا، خواہ وہ قدر کو پورا کرنے کے لئے ہو، سود کھلائے گا۔

۳۔ اگر کرنسی کی شرح میں کمی کو معتبر مانا جائے تو اس میں زیادتی کو بھی معتبر ماننا ہو گا۔ اگر کرنسی کی شرح قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے تو مقروض پر اسی قدر رقم واجب ہوگی جتنا کہ کرنسی کی قدر میں اضافہ ہوا ہے، اس بات کا امکان بلاشبہ بہت کم ہے لیکن اصول بناتے وقت اس کو بھی بہر حال مد نظر رکھنا پڑے گا اور یہ بات عملاً ممکن نہیں ہے، کوئی بھی قرض خواہ اس بات پر ہرگز تیار نہ ہو گا کہ اس کی رقم کا کچھ حصہ منہا کر لیا جائے۔

۴۔ کرنسی کی شرح میں کمی کے لئے حکومت کی طرف سے جو معیار متعین ہے وہ ہے کہ حکومت نے ۱۹۷۰ء کی قیمتوں کو معیار بنا کر اس میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے، کرنسی کی شرح اسی قدر کم کر دی جاتی ہے، احکام شریعت کی رو سے قرض کے لین دین میں قیمتوں کو معیار بنا کر رقم میں اضافہ سود کی تعریف میں داخل ہے۔

اس سلسلہ میں قابل غور امر یہ ہے کہ افراط زر کے ذمہ دار کیا امور ہیں اور زر کے اس رجحان پر کس طرح قابو پا کر اسے ایک مستحکم شرح پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ افراط زر میں بنیاد و معیار اشیاء ضرورت کی قیمتیں ہیں۔ اشیاء ضرورت کی بڑھتی ہوئی قیمتیں زر کی قدر میں کمی کا باعث بن رہی ہیں، زر کی قدر کو مستحکم کرنے کے لئے سب سے پہلے اشیاء ضرورت کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنا ہو گا۔ افراط زر پیدا ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں اہم تر اور بنیادی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

اجارہ داریاں:

صنعت و حرفت میں اجارہ داریاں زیادہ ہونے کے نتیجے میں مخصوص صنعتیں قیمتوں کو کنٹرول کرتی ہیں جس سے ملک میں افراط زر پیدا ہو جاتا ہے۔

بے روزگاری:-

بے روزگاری بھی افراط زر کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

طلب و رسد میں عدم توازن:-

طلب و رسد میں عدم توازن کی وجہ سے اشیاء ضرورت کی قیمتیں متاثر ہوتی ہیں اگر طلب زیادہ ہو اور رسد کم ہو تو مطلوبہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اسی طرح افراط زر پیدا ہوتا ہے۔

افراط زر کی ان وجوہ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ مذکورہ تینوں حالات سودی نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، سودی کاروبار اور سودی بنکاری سے اجارہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو ادارہ یا بینک کو بہر حال سرمایہ پر ایک خاص شرح سے سود ادا کرتا ہے، وہ صرف ایسا ہی کاروبار کرے گا جس میں منافع کی زیادہ سے زیادہ توقع ہو، اور منافع کی زیادہ سے زیادہ توقع ایسے کاروبار میں ہوتی ہے جہاں کسی ادارہ کی اجارہ داری ہو۔ اس طرح سودی نظام اجارہ داریوں کی افزائش کا سبب بنتا ہے اور اجارہ داریوں کی زیادتی سے افراط زر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سودی نظام معاشرہ میں بے روزگاری میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، جس قدر سود کی مقدار زیادہ ہوگی، بے روزگاری اسی قدر زیادہ ہوگی، سود کی شرح جتنی کم ہوگی، بے روزگاری میں بھی کمی واقع ہوگی۔ طلب و رسد میں عدم توازن کی بڑی وجہ بھی نظام سود ہے کہ اجارہ دار ادارے اپنی منشا کے مطابق اشیائے ضرورت میں قلت پیدا کرتے ہیں جس سے طلب و رسد میں توازن بگڑ جاتا ہے جو بالآخر افراط زر پر منج ہوتا ہے۔ افراط زر کی حقیقت، اور اس کے محرکات پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ سود اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے، سودی نظام کو ختم کرنے سے جو روپیہ چند ہاتھوں میں محدود رہتا ہے، اور وہ اس کی قدر و قیمت میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتے ہیں، زیادہ گردش میں آئے گا، اجارہ داریاں کم سے کم ہوں گی اور زر کی قدر کی شرح بھی متوازن ہوگی۔

مزید یہ کہ یہ تصور بھی غلط محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں سود کا حکم نازل ہوا، کرنسی کی قدر میں اتار چڑھاؤ نہ تھا اور نہ ہی مختلف کرنسیاں مروج تھیں۔ بعض روایات اس تصور کی نفی کرتی ہیں۔ بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ قریش مکہ یمن، شام، عراق، مصر اور حبشہ

کے تجارتی سفر کیا کرتے تھے۔ لہذا خرید و فروخت میں عام طور پر رومی دینار و درہم یمن کے سکے، کاروبار میں چلتے تھے۔ (۲۲)

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:-

" زمانہ جاہلیت میں درہم کئی طرح کے ہوتے تھے، جن میں زیادہ تر کھرے طبری اور بغلی تھے جو آٹھ اور چار دانگ کے ہوتے تھے۔ فاروق اعظم نے فرمایا کہ جو زیادہ مروج ہے، اسی کو لے لیا جائے۔ چنانچہ طبری اور بغلی درہم کا مجموعہ ۱۲ دانگ کا ہوتا ہے، آخر ایک درہم ۴ اور ۸ کی اوسط سے ۶ دانگ کا مقرر کر دیا گیا۔" (۲۳)

ان دو روایات سے تو یہ بات ثابت ہوئی کہ مختلف ممالک یا سلطنتوں کی کرنسیاں مکہ میں رائج تھیں اور کاروباری لین دین میں استعمال ہوتی تھیں۔ رہی یہ بات کہ کرنسی کی قدر میں اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، اس کا ثبوت بھی بلاذری کے ایک کلام سے ہوتا ہے۔

"جاہلیت میں اہل مکہ کے پاس ہر قل کے دینار بھی آتے تھے، اور ایرانیوں کے درہم، بنیہ بھی، عرب ان سکوں کو تول کر ان کے وزن کے اعتبار سے ان کی قدر و قیمت متعین کرتے اور پھر خرید و فروخت ہوتی۔" (۲۴)

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق ایران کے سکے عموماً گھسے ہوتے تھے اور وزن میں بھی برابر نہ ہوتے تھے۔ نیز شکل بھی مختلف ہوتی تھی، کیونکہ مختلف دارالضربوں سے بن کر نکلتے تھے، چنانچہ صرف تربیت یافتہ صراف ہی ان خرابیوں کو پہچان سکتے تھے اور جو سکے گردش میں تھے، ان کے معیار کو متعین کرتے۔ (۲۵) ان تمام روایات میں باہمی ربط پیدا کرنے سے دو نتائج سامنے آتے ہیں۔

الف۔ مکہ کی کاروباری منڈیوں میں مختلف قسم کے سکے مروج تھے۔

ب۔ ان سکوں کی قدر و قیمت کم زیادہ ہوتی تھی اور اس معیار کو متعین کرنے میں عرب تجار جو بین الاقوامی تجارت کے ماہر ہوتے تھے، اور ماہر صراف کی رائے فیصلہ کن ہوتی تھی۔ گویا یہ تجار اور صراف مل کر ایک ایسا ادارہ بنتے تھے جو کرنسی کی قدر و قیمت متعین کرتا

ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں اتار چڑھاؤ لازماً ہوتا ہو گا۔

چنانچہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سکے تعداد میں کم اور گردش میں زیادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ گھٹتے ہوں اور اپنی قدر کو روز بروز کم کرتے چلے جا رہے ہوں اور اسی وجہ سے قریش مکہ سود وصول کرتے ہوں۔

حواشی

- ۱۔ اصفہانی، حسن بن محمد امام، المفردات فی غریب القرآن، کراچی، اصح المطابع، ص ۴۷۸
- ۲۔ ۹۔ التوبہ، ۲۴
- ۳۔ ۱۰۳۔ الحجر، ۲
- ۴۔ ابن عربی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ، احکام القرآن، بیروت، دار المعرفہ، ج ۱، ص ۲۴۱
- ۵۔ سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن
- ۶۔ ۲۔ البقرہ، ۲۷۹
- ۷۔ یعنی، ابو محمد محمود ابن احمد، عمدہ القاری، بیروت۔ دار الفکر، ج ۱۱، ص ۲۰۱
- ۸۔ یعنی، ابو محمد محمود ابن احمد، عمدہ القاری، بیروت۔ دار الفکر، ج ۱۱، ص ۲۰۱
- ۹۔ محمد ثناء اللہ پانی پتی، قاضی، تفسیر مظہری، کونئہ، بلوچستان بک ڈپو، ج ۱، ص ۴۱
- ۱۰۔ بغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود، معالم التنزیل (تفسیر بغوی) ملتان، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ج ۱، ص ۲۶۴
- ۱۱۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، بلا سود بنکاری، لاہور، ادارہ منہاج القرآن، ص ۱۰۱
- ۱۲۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، بیروت، دار احیاء، ج ۳، ص ۴
- ۱۳۔ السید السابق، فقہ السنہ، بیروت، دار الکتب، ج ۳، ص ۴۶
- ۱۴۔ مصطفیٰ احمد زرقات، المدخل الی الفقہ الاسلامی الجز الثالث (الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید، بیروت، دار الفکر، ص ۱۱۸

- ۱۵- سرخسی، شمس الدین، المبسوط، بیروت، دار المعرفہ،
- ۱۶- الجوری، عبدالرحمن، کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ، بیروت، دار الفکر، ج ۳، ص ۳۶
- ۱۷- ایضاً
- ۱۸- ایضاً
- ۱۹- ۷، الاعراف، ۱۹۹
- ۲۰- اشرف علی تھانوی، مولانا، بیان القرآن، لاہور، مکتبہ الحسن، ج ۱، ص ۵۳
- ۲۱- ملا جیون، نور الانوار، کراچی، ایچ ایم سعید، ص ۱۱۱، ۱۲
- ۲۲- بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۶۸
- ۲۳- ابن خلدون، عبدالرحمن، مقدمہ ابن خلدون، بیروت، مؤسسہ الاعلیٰ ص ۲۶۱، ۶۳
- ۲۴- بلاذری، حوالہ مذکورہ
- ۲۵- انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ج ۳، بذیل سکہ